سلور جوبلی نمبر کی زیبائش میں اضافہ کرتی ایک خوش رنگ تحریر

گناہ گار لڑکی

طاہر جاوید مغل

کسی کی زندگی میں ہلچل کا باعث بن جانے والے کردار کی تاآگہی کا پُرماجرا احوال
ایک مشرقی لڑکی کا فسانہ۔ جبر کی آگ اس [illegible] کے جمال کا بدن ہی نہیں، جذبہ و احساس بھی پھونکے دے رہی [illegible]۔ خوابوں سے کھیلنا اور پیہم اذیت سہنا اس پاک دل و خوش خصلت کا مقدر تھا۔ لذتِ گناہ کو خود پر حرام کر لینے کی کٹھن مشقت کے دوران آسودگی کا ایک امکان جب اس کے سامنے آیا تو وہ بھی اس کے احساسِ درون پر بار ہو گیا۔

اس کا نام نجمہ پروین تھا لیکن سب اسے پروین کے نام سے ہی پکارتے تھے۔ وہ کافی خوب صورت لڑکی تھی۔ باپ کے سوا دنیا میں اس کا اور کوئی نہیں تھا۔ اس کی ساری محبتیں ساری چاہتیں صرف ایک اسی ہستی سے منسوب ہو گئی تھیں۔ پروین بھی عبدالغنی کے لیے جینے کا سہارا تھی۔ عبدالغنی نے ساری زندگی ریلوے کی ملازمت کی تھی۔ اب ریٹائرمنٹ کے بعد کپڑے کی ایک چھوٹی سی دکان اس کے روزگار کا ذریعہ تھی۔ بڑے دونوں بیٹوں کی شادیاں والدہ کی موجودگی میں ہی ہو چکی تھیں اور وہ دیارِ غیر میں جا بسے تھے۔ اب صرف پروین کے ہاتھ پیلے ہونے تھے اور چونکہ پروین کی والدہ اور عبدالغنی کی شریکِ حیات اس دنیا میں نہیں تھی لہٰذا بیٹی کا تمام تر بوجھ عبدالغنی کے سر پہ تھا اور گزرنے والے ہر دن کے ساتھ یہ بوجھ بڑھتا جا رہا تھا۔ یہ بوجھ بھی عجیب طرح کا تھا۔ اسے اپنے سینے پہ محسوس کر کے عبدالغنی کا دم گھٹتا لیکن بوجھ اتارنے کا خیال بھی اس کے لیے روح فرسا تھا۔ وہ یہ سوچ کر لرز جاتا کہ جب اس کے آنگن میں پروین کی چاپ بھی نہ رہے گی تو زندگی کتنی کٹھن اور بے معنی ہو جائے گی لیکن وہ یہ بھی جانتا تھا کہ بیٹیاں پرایا دھن ہوتی ہیں اور انہیں گھر میں رکھنا بادشاہوں کے لیے بھی ممکن نہیں ہوتا۔

محلے کی ایک دو بزرگ اور جہاندیدہ خواتین سے عبدالغنی نے پروین کے رشتے کے لیے کہہ رکھا تھا اور وہ کسی اچھے اور معقول رشتے کی تلاش میں تھیں۔ آخر ایک روز یہ تلاش رنگ لے آئی۔ بیگم کرامت نے عبدالغنی کو ایک خوبرو لڑکے کی تصویر دکھاتے ہوئے کہا "ناصر نام ہے اس کا۔ بی اے کر رکھا ہے۔ بڑے اچھے لوگ ہیں۔ بالکل جیسے تم چاہتے ہو۔ ہماری پروین انہیں پسند آجائے تو تین کپڑوں میں لے جانے کے لیے تیار ہو جائیں گے۔ لالچ تو نام کو نہیں ہے۔ بس ایک مسئلہ ہے اور میرے خیال میں وہ بھی کوئی ایسا مسئلہ نہیں ہے۔ لڑکا سنگاپور میں رہتا ہے۔ وہاں بڑی اچھی ملازمت ہے اس کی۔۔۔ پروین کو بھی اس کے پاس سنگاپور جانا پڑے گا۔"

سنگاپور کا نام سن کر عبدالغنی کے چہرے پر رنگ سا گزر گیا لیکن بہت جلد اس نے خود پر قابو پایا اور ٹھہری ہوئی آواز میں بولا "ان لوگوں میں سے کسی نے پروین کو دیکھا ہے؟"

"ہاں۔ بھائی حیات محمد اور ان کی بیگم نے دیکھا ہے۔ میرے بیٹے کی شادی پر آئے ہوئے تھے۔ پروین بھی وہاں تھی۔ بھائی حیات محمد نے خود مجھ سے پروین کے بارے میں پوچھا تھا۔"

جس وقت یہ باتیں ہو رہی تھیں، پروین چلمن سے لگی کھڑی تھی اور اس کا دل انوکھے انداز میں دھڑک رہا تھا۔

۔۔۔بعد کے تمام معاملات آناً فاناً ہی طے ہو گئے تھے۔ پروین کو یوں لگا جیسے کوئی الجھا سلجھا خواب دیکھ رہی ہو۔ پہلے حیات محمد اور ان کی بیگم پروین کو دیکھنے آئے، پھر ایک روز پروین کے والد اپنے ایک دور کے بھائی کے ساتھ حیات محمد کے گھر گئے۔ دو تین ملاقاتوں میں پروین اور ناصر کا رشتہ طے ہو گیا اور پندرہ روز بعد ان کے نکاح کی تاریخ قرار پائی۔ یہ نکاح ٹیلی فون پر ہونا تھا۔

۔۔۔نکاح سے ایک دن پہلے پروین اپنے بستر پر سر تک لحاف اوڑھے گم سم لیٹی تھی۔ اس کے سینے پر ایک کتاب دھری تھی اور آنکھیں بند تھیں۔ کھلی آنکھوں کے ساتھ زیادہ دور تک نہیں دیکھا جا سکتا لیکن بند آنکھوں کے ساتھ انسان ہزاروں لاکھوں [illegible] دور تک دیکھتا ہے اور حال ہی نہیں، ماضی اور مستقبل بھی اس کی نگاہوں کے سامنے ہوتا ہے۔ پروین بھی بہت دور تک اور بہت پیچھے تک دیکھ رہی تھی۔ اس کے سینے پر جو کتاب دھری تھی وہ شاعری کی تھی اور شاعر کا نام شیراز احمد تھا۔ شیراز احمد کی شاعری سے پروین کی دلچسپی لڑکپن سے تھی۔ شروع شروع میں وہ ش[illegible]

صرف پسند کرتی تھی پھر وہ اس کی پرستار بن گئی۔ تر و تازہ لہجے
ے اس نوجوان شاعر کی ہر تخلیق پروین کو اپنے دل کی آواز
وس ہونے لگی۔ جس کو چاہا اور سراہا جاتا ہے اسے دیکھنے کی
ش بھی ہوتی ہے۔ پروین بھی شیراز احمد کو دیکھنا چاہتی تھی۔ وہ
لوئر مڈل کلاس کی لڑکی تھی۔ اس کی پرواز اتنی اونچی نہیں تھی
ہ وہ جہاں چاہتی پہنچ سکتی اور جس سے چاہے مل سکتی۔ وہ گھر کی
دیواری اور کالج کی چار دیواری تک محدود تھی۔ وہ جانتی تھی
س کا محبوب شاعر اسی شہر میں رہتا ہے۔ انہی گلی کوچوں میں گھومتا
لیکن وہ اسے ڈھونڈ نہیں سکتی تھی اور شاید ڈھونڈنا چاہتی بھی
یں تھی۔ وہ ان ہزاروں لاکھوں لڑکیوں میں سے تھی جو صرف
ں میں محبت کرتی ہیں اور تصورات میں زندہ رہتی ہیں۔
ت کی دنیا چونکہ بہت مشقت طلب اور حوصلہ آزما ہوتی ہے
ا وہ حتی الامکان اس سے نظریں چراتی رہتی ہیں۔ پروین بھی
اپنے محبوب شاعر کو کبھی قریب سے نہ دیکھ پاتی لیکن ایک

اتفاق نے اسے یہ موقع فراہم کر دیا۔ ایک روز اخبار دیکھتے دیکھتے
اس کی نظر ایک چھوٹی سی خبر پر پڑی۔ یوم پاکستان کے موقع پر
گورنمنٹ کالج میں مشاعرہ "مشہور شعرا شرکت کریں گے"
شاعروں کی فہرست میں شیراز احمد کا نام بھی شامل تھا۔ پروین کے
جسم میں سنسنی سی دوڑ گئی۔ جس گورنمنٹ کالج میں یہ مشاعرہ ہو رہا
تھا وہاں پروین کی ایک قریبی سہیلی بھی پڑھتی تھی۔ اس کی مدد سے
پروین اس مشاعرے میں شریک ہو سکتی تھی۔ وہ صبح سے شام تک
سوچ بچار میں مصروف رہی پھر اس نے اپنی سہیلی رابعہ سے کہہ ہی
دیا کہ وہ مشاعرے پر جانا چاہتی ہے۔ رابعہ کو کیا اعتراض ہو سکتا
تھا۔ وہ اگلے روز پروین کو اپنے ساتھ کالج لے گئی۔ پروین کا دل
عجیب سے انداز میں دھڑک رہا تھا جیسے وہ کوئی چوری کرنے جا رہی
ہو۔ یہ کیفیت اس وقت تک برقرار رہی جب تک وہ مشاعرہ گاہ میں
پہنچ نہیں گئی اور اس نے شیراز احمد کو دیکھ نہیں لیا۔ وہ رابعہ کے
ساتھ دوسری قطار میں بیٹھی تھی۔ یہاں سے اسٹیج کا فاصلہ پندرہ

بیس فٹ سے زائد نہیں تھا۔ صرف چند رہ بیس فٹ دور وہ شخص موجود تھا جو پروین کے دل و دماغ کو تسخیر کر چکا تھا اور شب و روز اس کی سوچوں پر حاوی رہتا تھا۔ برقی قمقموں کی روشنی میں وہ یوں بیٹھا تھا جیسے برات میں دولہا۔ سرخ و سپید رنگت' جاذب نظر نقوش' پیشانی پر جھولتی بالوں کی لٹیں اور سب سے بڑھ کر اس کا باوقار انداز۔ جو غزلیں اور نظمیں پروین پچھلے چار سال سے پڑھتی رہی تھیں وہ ایسے ہی شاعر کی ہونی چاہئے تھیں۔ پروین اسے پروانہ وار دیکھتی رہی' یہاں تک کہ مشاعرہ ختم ہو گیا اور وہ چونک کر اٹھ بیٹھی۔

جو دبی دبی چنگاری اس کے سینے میں ایک مدت سے روشن تھی وہ شعلہ بن کر بھڑک اٹھی۔ شیراز احمد کی شاعری پڑھ پڑھ کر اس کے ذہن میں جو ایک خوبصورت شبیہ بنی تھی وہ شیراز احمد کو دیکھنے کے بعد مکمل ہو گئی تھی۔ اب یہ شبیہ ہر وقت اس کے تصور پر چھائی رہتی۔ شیراز کی شاعری اب اسے پہلے سے کہیں زیادہ لطف دینے لگی تھی۔۔۔ پھر ایک روز نجانے کیا ہوا کہ اس نے شیراز احمد کو خط لکھنے کی ٹھانی۔ شیراز احمد کا ایڈریس اسے چند ہی روز پہلے ایک ادبی رسالے میں سے ملا تھا۔ یہ ایڈریس اس نے بڑی احتیاط اور محبت سے اپنی ڈائری میں نوٹ کر لیا تھا۔

شیراز احمد کے نام پروین کا پہلا خط شاعری کے حوالے سے تھا۔ تاہم اس میں اپنی والہانہ پسندیدگی کا اظہار بھی کیا گیا تھا۔ اگلے خطوں میں پروین نے شاعری کے ساتھ ساتھ شیراز احمد کی ذات پر بھی تبصرے کیے اور اپنی اس وابستگی کا اظہار کیا جو وہ پچھلے کئی برسوں سے شیراز احمد کی شخصیت سے رکھتی تھی۔ دھیرے دھیرے وہ اپنے ان خوبصورت احساسات سے پردے سرکانے لگی جو وہ شیراز احمد کے بارے میں رکھتی تھی۔ وہ خوشبودار سوچیں' وہ ہفت رنگ خواب' وہ ریشمی جذبے جو ہمہ وقت اسے گھیرے رکھتے تھے۔ وہ ہر مرتبہ اپنا دل نکال کر کاغذ پر رکھ دیتی تھی لیکن اس خط و کتابت میں ایک خاص بات تھی۔۔۔ یہ ساری کارروائی یک طرفہ تھی۔ دو طرفہ ہو بھی کیسے سکتی تھی۔ پروین نے خطوط میں کبھی اپنا ایڈریس نہیں لکھا۔ نہ ہی کبھی دوبارہ شیراز احمد کی اس سے ملاقات ہوئی۔ کتنی عجیب بات تھی۔ وہ بہت سے خطوط اپنے محبوب شاعر کو لکھ چکی تھی اور یقیناً وہ خطوط اسے ملتے بھی تھے۔ ان خطوط کے ذریعے وہ پروین کے بارے میں بہت کچھ جان چکا تھا۔ پروین کون ہے؟ اس نے کہاں تک تعلیم حاصل کی ہے۔ اس کے گھر کا ماحول کیسا ہے۔ وہ کتنے بہن بھائی ہیں۔ وہ شکل و صورت اور قد کاٹھ کی کیسی ہے۔ اس کی پسند و ناپسند کیا ہے اور سب سے اہم بات یہ کہ وہ شیراز احمد سے کتنی گہری اور کتنی بے لوث محبت کرتی ہے؟ لیکن اس کے برعکس وہ شیراز کے بارے میں کچھ نہیں جانتی تھی۔ یہ بھی نہیں جانتی تھی کہ پروین کے خطوط پڑھ کر اس کا ردعمل کیا ہوتا ہے؟ ممکن ہے وہ انہیں پڑھے بغیر پھینک دیتا ہے۔ ممکن ہے پڑھتا ہو اور پڑھ کر ہنس دیتا ہو اور یہ بھی ممکن تھا کہ وہ ان خطوط میں پنہاں تڑپ اور محبت کو محسوس کرتا ہو اور پروین سے ملنا چاہتا ہو' اسے جاننا چاہتا ہو۔۔۔۔

انہی دنوں شیراز احمد کی پہلی کتاب بازار میں آئی۔ یہ اس کی شاعری کا پہلا مجموعہ "چاند رات" تھا۔ کتاب کی پشت پر شیراز احمد کی ایک خوبصورت تصویر بھی تھی۔ اس کتاب نے خواص و عوام میں مقبولیت حاصل کی اور دو ماہ بعد ہی اس کا دوسرا ایڈیشن چھپ گیا۔ یہ کتاب صبح و شام پروین کے سینے سے لگی رہتی تھی۔ کتاب سینے پر رکھے رکھے وہ سو جاتی تو کتاب کی تصویر زند[illegible] اسے اپنے حصار میں لے لیتی۔ گہری سیاہ سوچتی ہوئی آنکھیں' بکھرے بال' گداز ہونٹ اور کشادہ سینہ۔ وہ جیسے ساری رات اس کتاب اور کتاب کی تصویر کے ساتھ بسر کر دیتی۔ اسی کتاب میں ایک نظم "گمنام صدا" پروین کو بہت زیادہ پسند تھی۔ نجانے کیوں پروین کو محسوس ہوتا تھا کہ یہ نظم اسی کے لیے لکھی گئی ہے۔ شاعر نے ایک ایسی گمنام صدا کا ذکر کیا تھا جو رنگوں' جذبوں اور زندگی کی گداز حرارتوں سے معمور تھی۔ شاعر جب بھی اداس ہوتا تھا' یہ صدا اس کے کانوں میں گونجتی تھی اور ہزاروں جلترنگ اس کی روح میں بج اٹھتے تھے لیکن اس آواز کا کوئی ٹھکانا نہیں تھا۔ نہ یہ معلوم تھا کہ وہ کب ابھرے گی۔ کب سنائی دے گی اور کب خاموش ہو جائے گی۔

ممکن تھا شیراز احمد نے یہ نظم کسی اور جذبے کے تحت لکھی ہو' کوئی اور محرک ہو اس تخلیق کا لیکن پروین جب بھی نظم پڑھتی تھی اسے اپنی طرف منسوب کرنے پر مجبور ہو جاتی تھی۔۔۔ کئی موسم تصوراتی محبت کی اسی دھوپ چھاؤں میں گزر گئے۔ پروین اب فرسٹ ایئر سے فورتھ ایئر میں پہنچ چکی تھی۔ وہ بہار کا موسم تھا۔ پورے شہر میں گلاب کھلے ہوئے تھے۔ فضاؤں میں عجیب سی مستی تھی اور صبح و شام رنگین ہو رہے تھے۔ پروین کو رابعہ کی زبانی پتا چلا کہ موسم بہار کو خوش آمدید کہنے کے لیے الحمرا آرٹس کونسل میں کل پاکستان مشاعرہ ہو رہا ہے۔ شاعروں کی فہرست میں جواں نسل کے مقبول شاعر شیراز احمد کا نام بھی شامل تھا۔ مشاعرے کی شام پروین بھی کھنچی ہوئی سی الحمرا میں پہنچ گئی۔ مشاعرہ ہوا اور خوب ہوا۔ پروین کے شاعر نے بھی خوب خوب داد سمیٹی۔ مشاعرے کے آخر میں کچھ سامعین شعرائے کرام سے آٹوگراف لینے لگے۔ پروین اور رابعہ نے بھی شیراز احمد سے آٹوگراف لیا۔ آٹوگراف بک واپس لیتے ہوئے پروین کا ہاتھ شیراز احمد کے ہاتھ سے مس ہو گیا۔ وہ جیسے ہزاروں وولٹ کے ننگے تار سے چھو گئی تھی۔ اس کے پورے بدن میں برقی لہریں دوڑ گئیں۔ اس رات وہ صبح تک جاگتی رہی تھی۔ اس کا جی چاہا وہ شاہراہ زندگی پر محبت کی یک طرفہ "ٹریفک" ختم کر دے۔ کم از کم ایک بار تو یہ جاننے کی کوشش کرے کہ فریق ثانی کے خیالات اور جذبات اس کے بارے میں کیا ہیں۔ وہ کیوں

sPK.com

...ت بے در گنبد میں قید ہو کر بیٹھی ہوئی تھی۔ کیوں اس نے اپنی طرف آنے والے تمام راستے بند کر رکھے تھے۔ ایک عجیب آگ سی اس کے بدن میں پھیل رہی تھی۔ شاعری اور شاعر کی محبتیں یکجا ہو کر ایک منہ زور جذبے کی حیثیت اختیار کر گئی تھیں۔ شعر ہونٹ بن گئے تھے' آنکھیں بن گئے تھے' باتیں بن گئے تھے اور شیراز احمد مجسم شاعری بن کر اسے اپنے منہ زور دھارے میں بہائے لیے جا رہا تھا۔ سہ پہر کو کالج سے واپس آتے ہوئے جیسے اس کے قدم خود بخود فیروز پور روڈ کی طرف اٹھ گئے تھے فیروز پور روڈ جہاں شاہ جمال کالونی میں شیراز احمد کے ذاتی رسالے کا دفتر تھا۔ وہ خود بھی کبھی کبھار نظمیں لکھتی تھی' اپنی ٹوٹی پھوٹی تحریریں چھپوانے کی آڑ میں وہ شیراز احمد سے مل سکتی تھی۔ اس سے راہ و رسم بڑھا سکتی تھی اور اسے یہ بھی بتا سکتی تھی کہ پچھلے پانچ سال سے اسے جو محبت بھرے خطوط مل رہے ہیں ان کی لکھنے والی وہی ہے۔

وہ جیسے خواب میں چلتی ہوئی شیراز احمد کے دفتر تک پہنچ گئی تھی۔ لیکن عین وقت پر وہ رک گئی۔ نجانے کیا ہوا تھا۔ شاید وہ شرم و حیا سامنے آ گئی تھی جو مشرقی عورت کا زیور کہلاتی ہے۔ شاید خاندانی شرافت نے اس کا راستہ روکا تھا۔ یا پھر فطرت نے اس کے ذہن کے کمپیوٹر میں جو پروگرام "فیڈ" کیا تھا اس میں یہ "لکھن" شامل ہی نہیں تھا کہ وہ آگے بڑھ کر اپنے "محبوب" کے دروازے پر دستک دے گی۔ وہ واپس لوٹ آئی تھی۔ یہ اس کی "دلیرانہ کوششوں" کی انتہا تھی۔ وہ اس سے آگے نہیں بڑھ سکتی تھی' لہٰذا اپنی جگہ اپنے مقام پر خاموش بیٹھ گئی' اس موہوم امید کے سہارے کہ شاید کبھی کوئی انہونی ہو جائے اور جس دروازے پر وہ دستک نہیں دے سکی تھی وہ خود بخود کھل جائے۔ کچھ اور مشرقی لڑکی کے بس میں نہ ہو لیکن خواب تو اس کے بس میں ہوتے ہیں اور پروین بھی پھر خواب دیکھنے لگی تھی..... خواب جو کبھی پورے نہیں ہوتے۔

تھوڑے ہی عرصے میں پروین کے احساسات اور جذبات میں ٹھہراؤ سا آ گیا۔ پھر اس کی والدہ فوت ہو گئیں اور وہ اپنے بوڑھے باپ کے ساتھ گھر کی چار دیواری میں تنہا رہ گئی۔ بوڑھے باپ کی کمزوری اور ناتوانی دیکھ دیکھ کر اس کا دل کڑھتا تھا۔ وہ سوچتی تھی جب وہ بھی اس گھر میں نہ رہے گی تو ابا کی دیکھ بھال کون کرے گا۔ امی کے انتقال کے بعد ابا بھی بیمار بیمار سے رہنے لگے تھے' وہ ہر وقت ان کی دیکھ بھال اور خدمت میں مصروف رہتی۔ یوں جہاں اسے روحانی سکون ملتا وہاں لایعنی خیالات سے بھی اس کی جان چھٹی رہتی۔ شیراز احمد کی تصویر اس کے تصور سے اوجھل تو نہیں ہوئی تھی لیکن اب اس میں پہلے والی چمک دمک باقی نہیں رہی تھی۔ شیراز احمد کی محبت جو ایک منہ زور طوفانی ریلے کی شکل اختیار کر گئی تھی' اب ایک ہموار پُرسکون ندی کی طرح اس کی ذات کی اتھاہ گہرائیوں میں بہتی تھی اور اس ندی کی موجودگی سے صرف وہی باخبر تھی۔

○☆○

اور اب پروین کی شادی ہو رہی تھی۔ کل اس کا نکاح تھا اور پھر ہوا کے دوش پر سوار ہو کر اسے ہزاروں میل دور اپنے پیا کے دیس سدھارنا تھا۔ پروین کی خاموش محبت کی کہانی وہی تھی جو ہزاروں سال سے دہرائی جا رہی ہے اور اس کا انجام بھی قریباً قریباً وہی تھا۔

○☆○

اگلے روز فون پر نجمہ پروین دختر عبدالغنی کا نکاح ناصر الدین ولد حیات محمد سے ہو گیا۔ پروین کا شوہر خود پاکستان نہیں آ سکتا تھا لہٰذا پروین کو اس کے پاس جانا تھا۔ آٹھ دس روز وہ اپنے سسرال میں رہی پھر اس کے سفری کاغذات مکمل ہو گئے۔ ٹکٹ آ گیا اور وہ پیا دیس سدھارنے کے لیے تیار ہو گئی۔ پروین کے سسر کو اس کے ساتھ جانا تھا۔ لیکن عین وقت پر قریبی رشتے داروں میں ایک موت ہو گئی اور پروین کو اکیلے رخصت ہونا پڑا۔ وہ لاہور ایئرپورٹ سے یوں رخصت ہوئی جیسے دلہن اپنے گھر کی دہلیز سے رخصت ہوتی ہے۔ عجیب رخصتی تھی یہ' نہ برات' نہ بینڈ باجا' نہ شہنائی کی گونج نہ سہیلیوں کے جھرمٹ۔ وہ اپنے باپ اور سسر سے گلے ملی' اپنی ساس کا پیار لیا اور کاغذات دکھا کر ڈپارچر لاؤنج میں داخل ہو گئی۔ اسے سفر کے بارے میں سب کچھ سمجھایا جا چکا تھا۔ یہ بھی معلوم تھا کہ اس کا شوہر سنگاپور کے ایئرپورٹ پر اسے لینے کے لیے موجود ہو گا۔ دیگر تمام ہدایات بھی اسے ازبر تھیں لیکن پھر بھی اس کا دل انجانے خوف سے دھڑک رہا تھا اور وہ کسی ایسی بچی کی طرح قدم اٹھا رہی تھی جس نے نیا نیا چلنا سیکھا ہو۔

سفر بخیر و خوبی گزرا۔ ایئرپورٹ پر ناصر اسے ریسیو کرنے کے لیے موجود تھا۔ وہ ناصر کی کئی تصویریں دیکھ چکی تھی۔ ناصر اپنی تصویروں سے قدرے مختلف نظر آیا تاہم پروین کو پہچاننے میں دشواری نہیں ہوئی۔ ناصر نے بھی پروین کو بہ آسانی پہچان لیا۔ شاید ناصر نے اس کی تصاویر نہ بھی دیکھی ہوتیں تو پہچان لیتا۔ خوبصورت' کٹی سنتائی' حیا کے رنگوں سے چہرہ گلنار کیے ہوئے لڑکی اس کی دلہن کے سوا اور کون ہو سکتی تھی۔ وہ پروین کو دیکھ کر جلدی سے اس کے قریب آ گیا "السلام علیکم" اس کی مردانہ آواز پروین کے کانوں میں گونجی۔

"وعلیکم السلام" وہ پلکیں اٹھا کر بمشکل کہہ سکی۔

اسے محسوس ہوا کہ وہ سرتاپا لرز رہی ہے۔ جیسے وہ حجلۂ عروسی میں پھولوں کی سیج پر بیٹھی ہے اور اس کا دلہا گھونگھٹ اٹھا رہا تھا۔ یہ کیسا انوکھا ملاپ تھا۔ وہ ہزاروں میل سے چل کر اپنے دلہا کے پاس آئی تھی' اور وہ پہلی بار ایئرپورٹ پر ایک دوسرے کو دیکھ رہے تھے۔

"چلو پروین" ناصر نے اپنائیت سے کہا۔
اس کے لہجے اور انداز نے پروین کو آگے بڑھنے کا حوصلہ دیا' ورنہ تو اسے لگ رہا تھا کہ وہ پتھر کے بت کی طرح اپنی جگہ کھڑی رہ جائے گی اور لوگ اسے دیکھ کر ہنسنے لگیں گے۔ ائرپورٹ کی عمارت سے نکل کر وہ ایک کار میں آبیٹھے۔ یہ ناصر کی ذاتی کار تھی۔ اس وقت رات ہو رہی تھی۔ سنگاپور کی سڑکیں رنگ و نور میں ڈوبی ہوئی تھیں۔ پروین کو یہ سب خواب کا سماں لگ رہا تھا۔ ناصر کا فلیٹ خوبصورت تھا اور ایک صاف ستھرے علاقے میں واقع تھا۔ اس فلیٹ میں ناصر اور پروین کے سوا اور کوئی نہیں تھا۔ ناصر نے پروین کی خاطر تواضع کے لیے تین دن کا کھانا پہلے ہی پکوا کر فریج میں رکھا ہوا تھا۔ صرف کھانا گرم کرنے کے لیے انہیں چولہا جلانا پڑتا تھا۔ ایک دن تو مکمل آرام میں گزرا پھر اگلی شام ناصر نوبیاہتا بیوی کو لے کر سیر و تفریح کے لیے نکلا "سنگاپور دیکھنے چلو گی؟" اس نے پوچھا تھا۔
"جیسے آپ کی مرضی" وہ پلکیں جھکائے جھکائے بولی تھی۔
ناصر کی قربت اس کے دل کو بے طرح دھڑکا رہی تھی۔ وہ رات گئے تک سنگاپور کے ہنگاموں میں پھرتے رہے۔ وہ رات پروین کی سہاگ رات بھی تھی۔ خوشبوؤں' رنگوں اور سرگوشیوں میں ڈوبی ہوئی رات جو پروین پر زندگی کے نئے مطالب و معانی کھول گئی۔ وہ شخص جو دو روز پہلے تک اس کے لیے اجنبی تھا اب رگ جان سے بھی قریب آچکا تھا۔ پروین کو یوں لگا جیسے زندگی کا سفر اس کے لیے آسان ہو گیا ہے۔ ناصر کی اپنائیت' محبت اور خوش سلوکی نے اسے اپنا گرویدہ کر لیا تھا۔
قریباً ایک ماہ تک وہ دونوں جیسے ہواؤں کے دوش پر اڑتے رہے۔ ان کی مصروفیات کھانے پینے اور سیر و تفریح تک محدود تھیں۔۔۔ آخر ناصر کی چھٹیاں ختم ہو گئیں۔ وہ پھر سے دفتر جانے لگا۔ پروین نے کچن تو پہلے ہی سنبھال لیا تھا اب اس نے فارغ وقت میں مصروف رہنے کے لیے گھر کا دیگر کام کاج بھی شروع کر دیا۔ ناصر کے بہت منع کرنے کے باوجود اس نے گھریلو ملازمہ کو چھٹی دے دی تھی۔ وہ ناصر کی تمام ضروریات کا خیال رکھتی تھی اور اس کی خدمت کر کے اسے دلی سکون محسوس ہوتا تھا۔ خاص طور پر وہ ناصر کے لیے جو وقت کچن میں گزارتی تھی وہ بہت اچھا گزرتا تھا۔ ناصر کو نت نئے کھانے کھلانا اور اسے کھاتے دیکھ کر خوش ہونا پروین کی "ہابی" بن گئی تھی۔ ایک مشرقی بیوی کی تمام خوبیاں پروین میں بدرجہ اتم موجود تھیں اور اس کی ان خوبیوں نے ناصر کو اس کے حلقہ احباب میں قابل رشک بنا دیا تھا۔ لیکن پھر یوں ہوا کہ دھیرے دھیرے پروین کو ناصر کے رویئے میں تبدیلی کا احساس ہونے لگا۔ اسے لگا جیسے وہ پروین سے کچھ کہنا چاہتا ہے لیکن کہہ نہیں سکتا۔ کبھی کبھی وہ "ان کہی" کے ان مشکل الفاظ کو زبان پر لانے کے لیے بالکل بےتاب نظر آتا لیکن، پھر ان کہی۔۔۔ ان کہی ہی رہتی اور ناصر پہلے سے زیادہ بیزار اور جھلایا ہوا نظر آتا۔ پروین یہ بھی دیکھ رہی تھی کہ ناصر کا زیادہ تر وقت گھر سے باہر گزرتا ہے اور اس کے دوستوں میں بھی نئے نئے چہرے نظر آتے ہیں۔ ان [illegible] سے کچھ چہرے پروین کو ناپسند تھے اور وہ دبی زبان میں ناصر سے [illegible] ذکر بھی کر چکی تھی۔ پروین نہیں چاہتی تھی کہ نشے میں غرق ر[illegible] والے اور آزادانہ گفتگو کرنے والے دوست ناصر کے ساتھ فلیٹ میں آئیں اور رات گئے تک براجمان رہیں۔ ان ناپسندیدہ دوستوں کی وجہ سے پروین اور ناصر کے درمیان ایک خلیج سی حائل ہوتی جا رہی تھی۔ اب وہ خود بھی روزانہ ڈرنک کرنے لگا تھا اور سگریٹ تو ہر وقت اس کی انگلیوں میں جلتی رہتی تھی۔ نجانے یہ تبدیلی کیوں آئی تھی؟ یا پھر ناصر شروع ہی سے ایسا تھا۔ صرف پروین کی خاطر اس نے دو ڈھائی ماہ اپنا روپ بدلے رکھا تھا۔ ناصر کا بدلا ہوا روپ دیکھ کر پروین کے دل میں بہت سے خوابیدہ خدشے بیدار ہونے لگے تھے۔ پاکستان سے والد کے خطوط اکثر اسے ملتے رہتے تھے۔ وہ انہیں خیر خیریت سے آگاہ کرتی تھی۔ اپنی زندگی میں آنے والی بےچینی کی لہر سے اس نے سب کو بےخبر رکھا تھا۔
ایک روز انتہا ہو گئی۔ ناصر اکثر دوستوں کی محفل میں پروین کو بھی بلا لیتا تھا۔ کبھی چائے وغیرہ لانے کے بہانے' کبھی کوئی دلچسپ لطیفہ سنانے کے لیے اور کبھی ویسے ہی کسی سے تعارف کرانے کے لیے۔ شروع شروع میں پروین کا خیال تھا کہ ناصر فطری طور پر روشن خیال ہے اور آزادانہ سوچ رکھتا ہے' وہ نہیں چاہتا کہ پروین اس کے حلقہ احباب سے کٹی رہے اور اس کے دوستوں سے گھونگھٹ نکال کر ایک طرف بیٹھی رہے۔ وہ اسے اپنے ماحول میں رچانا بسانا چاہتا ہے لیکن بہت جلد پروین کو اپنا یہ خیال باطل محسوس ہونے لگا۔ اسے یوں لگنے لگا جیسے وہ ناصر کی بیوی نہیں کوئی نمائشی چیز ہے جسے ناصر اپنے دوستوں کو دکھاتا ہے اور ان کی نگاہوں میں حرص و ہوس کی چنگاریاں دیکھ کر دل ہی دل میں خوش ہوتا ہے۔۔۔ ایک روز ڈرائنگ روم میں تاش کا کھیل ہو رہا تھا۔ سامنے ٹیبل پر وہسکی کی دو بوتلیں بھی موجود تھیں۔ پورا کمرا سگریٹ کے دھوئیں سے بھرا ہوا تھا۔ پروین دو دفعہ چائے بنا کر ڈرائنگ روم میں بھجوا چکی تھی' اب کچن کی صفائی کر رہی تھی۔ وہ ہفتے کی رات تھی اس لیے محفل کچھ زیادہ ہی رنگ پر آئی ہوئی تھی۔ رات دس بجے کے لگ بھگ فون کی گھنٹی بجی۔ یہ کال ناصر کے ایک دوست کے لیے تھی۔ کال سن کر وہ واپس چلا گیا۔ تھوڑی دیر بعد ناصر کچن میں آگیا۔ کہنے لگا "چلو پروین! ذرا ہمارا ساتھ دو۔"
"کس بات میں؟" پروین نے پوچھا۔
"بھئی کھیل میں اور کس میں۔ آصف کے جانے سے ایک پارٹنر کم ہو گیا ہے۔ دس منٹ کی بات ہے' ورنہ سارا مزہ کرکرا ہو جائے گا۔"
"ناصر! آپ کیا کہہ رہے ہیں" پروین نے تیوری چڑھا کر دبی

sPK.com

آواز میں کہا "تمہیں وہاں ان لوگوں میں بیٹھ کر تاش کھیلوں گی؟"
"بھئی وہ کوئی بیگانے تو نہیں۔ گھر کے افراد کی طرح ہیں اور ان میں سے کوئی آدم خور بھی نہیں جو تمہیں کھا جائے گا" ناصر نے مزاحیہ لہجے میں کہا۔
"پلیز ناصر! یہ مجھ سے نہیں ہو گا۔ مجھ سے ایسے کام مت کروایا کریں۔"
"او کم آن یار" ناصر نے بے تکلفی سے اس کا بازو پکڑ کر کھینچا تو وہ اٹھنے کی کوشش میں کرسی سے ٹکرا گئی۔ اس کے گھٹنے پر چوٹ آئی اور ایک دو چوڑیاں بھی ٹوٹ گئیں۔ وہ گھٹنوں میں چہرہ چھپا کر سسکنے لگی "بالکل خشک ہو تم" ناصر نے تلخ سرگوشی کی اور تیز قدموں سے ڈرائنگ روم کی طرف چلا گیا۔

اس رات پروین نے کھانا بھی نہیں کھایا اور بستر پر بڑی دیر تک سسکتی رہی۔ رات ایک بجے کے لگ بھگ دوستوں کی محفل برخاست ہوئی اور ناصر سونے کے لیے کمرے میں آیا۔ پروین گم صم لیٹی رہی۔ اس نے شب خوابی کا لباس پہننے کے بعد لائٹ آف کی اور اس کے بالوں میں انگلیاں پھیرنے لگا۔ پروین اب تک اس سے صرف دو بار روٹھی تھی اور دونوں دفعہ اس نے بڑی آسانی سے منا لیا تھا۔ وہ منانے کا فن جانتا تھا' پروین اس کی باتوں سے موم کی طرح پگھل جاتی تھی۔ پھر اس کے ہاتھ اس موم سے جو چاہے بنا لیتے تھے۔ اس بار بھی ایسا ہی ہوا۔ پروین چند منٹ سے زائد اپنی ناراضگی برقرار نہ رکھ سکی اور ناصر کی گرم جوش محبت میں بہتی چلی گئی۔ بیڈ روم کی گھٹا ٹوپ تاریکی میں فقط ان کے سانسوں کی گونج تھی۔ اسی دوران ناصر اپنے سگریٹ وغیرہ رکھنے کے لیے الماری تک گیا اور واپس آگیا۔ وہ ایک بار پھر ایک دوسرے میں گم ہونے لگے اور تاریکی انہیں اپنے اندر گم کرنے لگی۔ یکایک ۔۔۔ پروین کو ایک عجیب احساس ہوا۔ ایک ایسا احساس جس کو لفظوں میں بیان کرنا ممکن نہیں تھا۔ لفظوں میں بیان کرنا تو دور کی بات ہے اسے ذہن میں لانا بھی ممکن نہیں تھا۔ پروین کا ذہن کسی انتہائی برق رفتار کل پرزے کی طرح ایک سیکنڈ میں ہزار ہا دفعہ گھوم گیا۔ اس کے ہاتھ ناصر کی کلائیوں پر تھے۔ اسے یوں لگا۔۔۔۔ جیسے یہ ناصر کی کلائیاں نہیں۔ بے حد تیزی سے اس کا ہاتھ ناصر کے شانوں' گردن اور چہرے پر دوڑ گیا۔ اس نے تاریکی میں آنکھیں پھاڑ کر دیکھا۔ اس کی آنکھوں کو کچھ نظر نہیں آیا۔ لیکن اس کے لرزاں ہاتھ "کچھ" دیکھ چکے تھے۔ ایک لمحے کے لیے پروین کو یوں محسوس ہوا جیسے اس کی حرکت قلب بند ہو جائے گی۔ پھر اس کے رگ و پے میں ایک حیوانی قوت دوڑی اور اس نے وحشیانہ جھٹکے سے "ناصر" کو دور پھینک دیا۔ اس کے ساتھ ہی اس کے حلق سے ایک لرزہ خیز چیخ بلند ہوئی تھی۔ وہ تڑپ کر اٹھی اور اندھوں کی طرح ہاتھ پاؤں چلاتی سوئچ بورڈ کی طرف بڑھی۔ لیکن

لیا۔
"کون ہو تم۔۔۔ کون ہو تم؟" پھر [illegible] پھیپھڑوں کی پوری قوت سے چیخی۔
تاریک سائے کے حلق سے دبی دبی غراہٹ نکلی۔ یہ آواز ناصر کی ہرگز نہیں تھی۔ یکایک پروین کے ذہن میں پھلجھڑیاں سی چھوٹ گئیں۔ وہ بے ہوش ہو چکی تھی۔

O☆O

دوبارہ اس کی آنکھیں کھلیں تو وہ فلیٹ کے ہی ایک اندرونی کمرے میں تھی۔ اب اس کے جسم پر شب خوابی کا لباس تھا۔ کھڑکی سے آنے والی روشنی سے پتا چلتا تھا کہ اس خوفناک رات کی صبح ہو چکی ہے جو کسی باؤلی چمگادڑ کی طرح اس کے ذہن سے چمٹی ہوئی ہے۔ ناصر اس کے پاس ہی صوفے پر بیٹھا تھا۔ گئی رات کے واقعات برق کوندے کی طرح اس کے ذہن میں تازہ ہوئے اور پروین کے تن بدن میں انگارے ہی انگارے بھر گئے۔ اسے یاد آیا کہ ناصر سگریٹ رکھنے کے لیے الماری کی طرف گیا تھا اور جو واپس آیا تھا وہ ناصر نہیں تھا۔ وہ سرتاپا جل اٹھی۔ اس میں ہمت ہوتی تو وہ تڑپ کر ناصر پر جا پڑتی اور اپنے ناخنوں سے اس کا چہرہ یوں نوچتی کہ کوئی اسے پہچان نہ سکتا۔ لیکن اس میں اتنی ہمت نہیں تھی۔ شاید وہی کمپیوٹر اور ذہن والی بات تھی۔ فطرت نے اس کے ذہن کے کمپیوٹر میں یہ پروگرام "فیڈ" ہی نہیں کیا تھا کہ وہ اپنی زندگی کی بدترین رات کی صبح اپنے بے غیرت شوہر پر حملہ کرے گی اور اس کا منہ نوچ کر ناقابل شناخت بنا دے گی۔۔۔ ہاں رونا تھی یہ بات اس کے بس میں۔
اس نے اپنا چہرہ بازوؤں میں چھپایا اور دھاڑیں مار مار کر رونے لگی۔ یہ فلیٹ عمارت کی آخری منزل پر واقع تھا اور ویسے بھی الگ تھلگ تھا۔ ناصر کو خدشہ نہیں تھا کہ پروین کی چیخ پکار باہر سنی جائے گی لہٰذا وہ اپنی جگہ اطمینان سے بیٹھا رہا۔
"یہ تم نے کیا کیا میرے ساتھ ناصر۔۔۔ یہ تم نے کیا کیا" وہ روتے روتے فریاد کناں لہجے میں بولی۔ اپنی آواز اسے اپنے ہی کانوں میں اجنبی محسوس ہو رہی تھی۔ ناصر نے کوئی جواب نہ دیا' بس سر جھکائے بیٹھا رہا۔ اس کے جواب دینے یا نہ دینے سے کوئی فرق نہیں پڑتا تھا۔ اپنی بدبختی پروین کے لیے کوئی ڈھکی چھپی بات نہیں رہی تھی۔ اس کی شادی نہیں ہوئی تھی' وہ ایک بے غیرت شخص کی ہوس کا شکار ہوئی تھی۔ اور یہ بے غیرت شخص اب اسے اپنے دوستوں کی ہوس کا چارا بنانا چاہتا تھا۔۔۔ پچھلے دو تین ہفتے ان کے بیڈ روم میں گہری تاریکی رہتی تھی۔ پروین کا خیال تھا کہ شاید ناصر تاریکی میں سونا پسند کرتا ہے۔ اب اسے خبر ہو رہی تھی وہ تاریکی ایک بھیانک سازش کے تانے بانے کا حصہ تھی۔ یہ ممکن تھا کہ کل رات گزرنے والا سانحہ پروین کے لیے "پہلا" نہ ہو۔ اس سے پہلے بھی وہ اس روح فرسا سانحے سے دوچار ہو چکی

ksPK.com

...دیکھی' یہ اجنبی درودیوار اور ان درودیوار کی اندھی تاریکی میں کسی بھی وقت "جہنم" بدل سکتا تھا۔ کسی بھی کے شوہر کی جگہ کوئی دوسرا لے سکتا تھا۔ جب انسان اتر آئے اور اس برائی کے نتائج و عواقب سے نمٹنے کی بھی کرلے تو پھر وہ براانتہا تک جاسکتا ہے۔ پروین رو رہی تھی سوچ کر اس کا دماغ چیخ رہا تھا۔ یہ کیسے ہو سکتا تھا کہ اس شوہر کی جگہ کوئی اور ہو اور وہ محسوس نہ کرسکے۔ وہ کتنی بھی تو کتنی بھی سیدھی سادی سہی لیکن ایسا بھیانک دھوکا نہیں کھا سکتی۔ یقیناً کل رات گزرنے والا سانحہ پہلا سانحہ تھا۔ لیکن اسے کیا فرق پڑتا تھا کہ وہ پہلا سانحہ تھا' دوسرا تھا' یا چوتھا' وہ غلاظت کے عمیق گڑھے میں گرچکی تھی اور اس کا جی چاہ رہا اسی وقت خودکشی کرلے۔ دوڑ کر جائے اور چھٹی منزل سے چھلانگ لگادے یا ناصر کا پستول تلاش کرکے ایک گولی سر میں اتارلے۔ لیکن شاید وہ ایسا نہیں کرسکتی تھی۔ دست سے خودکشی کا "پروگرام" ابھی اس کے ذہن میں فیڈ نہیں کیا۔ وہ روتی رہی اور لگاتار روتی رہی۔ دل میں آتش فشانی کا عمل رہا اور پگھلا ہوا لاوا اس کی آنکھوں سے بہتا رہا۔ ناصر کچھ اس کے پاس بیٹھا رہا' پھر کھڑکیوں کے پردے کھینچ کر باہر نکل

دوپہر تک پروین کی آنکھیں برستی رہیں پھر وہ نڈھال سی ہو کر ... دوبارہ آنکھ کھلی تو وال کلاک شام پانچ بجے کا وقت بتا رہا ... اس نے دیکھا سائیڈ ٹیبل پر ایش ٹرے کے نیچے ایک نیلا کاغذ ہے۔ کاغذ پر ناصر کی تحریر اس نے دور ہی سے پہچان لی۔ اس تحریر پڑھنا شروع کی۔ لکھا تھا۔

"عزیز پروین! میں اپنے آپ کو دنیا کا بدترین انسان تصور کررہا ہوں۔ مجھ میں اتنی ہمت نہیں کہ تم سے آنکھیں ملا سکوں۔ ... جیسی لڑکی کو دکھ دے کر میں اندر سے ٹکڑے ٹکڑے ہو گیا ہوں۔ جی چاہتا ہے خودکشی کرلوں۔ لیکن پھر سوچتا ہوں کہ میری ... سے تمہاری مصیبتیں کم تو نہیں ہوجائیں گی۔ وہ مزید بڑھ جائیں گی۔ پروین اب جو بات میں کہنے لگا ہوں اس پر بڑی سنجیدگی سے غور کرنا اور اس امر پر پختہ یقین رکھنا کہ میں جھوٹ نہیں بول رہا پروین! در حقیقت میں بہت بری طرح کچھ خطرناک لوگوں میں پھنس چکا ہوں۔ وہ ہر جگہ اور ہر وقت میری نگرانی کرتے ہیں۔ ... دوستوں میں بھی ان کے مخبر شامل ہیں۔ یہ لوگ پرلے درجے کے سفاک ہیں۔ میری اور تمہاری جان لینا ان کے لیے ... مسلنے کے برابر ہے۔ اب ہمارے سامنے دو ہی راستے ہیں' یا ... کہنے پر بے چون وچرا عمل کریں یا تکلیفیں جھیل کر جان دے دیں۔ شاید تم سوچو کہ میں بدترین ذلتیں جھیلنے کے بجائے سنگاپور کی پولیس کو اطلاع کیوں نہیں دیتا جو اپنی گرفت کی وجہ سے بہت مشہور بھی ہے' یا میں یہاں سے فرار کیوں نہیں ہوجاتا۔ تم یہ باتیں سوچ سکتی ہو کیونکہ تمہیں ابھی کچھ معلوم نہیں۔ لیکن میں نہیں سوچ سکتا۔ میں نے ہر جتن کرکے دیکھ لیا ہے۔ ان لوگوں کے چنگل سے نکلنا ناممکن ہے۔ فیصلہ بے حد تکلیف دہ ہے لیکن اب تمہیں ہی کرنا ہے۔ تم اپنی اور اپنے بے بس شوہر کی جان بچانا چاہتی ہو اور کسی اچھے وقت کا انتظار کرنا چاہتی ہو یا موت کو گلے لگانا چاہتی ہو۔ میں ہر دو صورتوں میں تمہارا ساتھ دوں گا۔"

فقط تمہارا بدنصیب شوہر

خط کے الفاظ پروین کی آنکھوں کے سامنے ناچ رہے تھے۔ ہر طرف نیلی پیلی نارنجی چنگاریاں سی اڑ رہی تھیں۔ کچھ ہی دیر بعد دروازے پر آہٹ ہوئی اور ناصر کمرے میں آگیا۔ اس کے ہاتھ میں کھانے کی ٹرے تھی۔ اس نے ٹرے احتیاط سے سائیڈ ٹیبل پر رکھی اور آہستگی سے بولا "کھانا کھالو پروین۔"

کتنی ملائمت اور اداسی تھی اس لہجے میں لیکن اس ملائمت اور اداسی میں بناوٹ کے سوا اور کچھ نہیں تھا۔ یہ بناوٹ ایک تیز دھار نکیلے خنجر کی طرح پروین کے سینے میں پیوست ہو رہی تھی۔ اس نے کن انکھیوں سے ناصر کی طرف دیکھا۔ وہ کھانے کی ٹرے کی طرف متوجہ تھا۔ کتنا معصوم اور مظلوم نظر آنے کی کوشش کررہا تھا وہ۔ اسے دودھ پیتی بچی سمجھتا تھا کہ من گھڑت قصوں سے بہلانے کی کوشش کررہا تھا۔ پروین کو سو فیصد یقین تھا کہ ناصر کا خط الف سے ے تک جھوٹ ہے۔

بے اختیار اس کا ہاتھ کھانے کی ٹرے کی طرف بڑھا اور اس نے ٹرے کو دھکیل کر فرش پر پھینک دیا۔ پھر وہ بستر سے اٹھی اور روتی ہوئی دروازے کی طرف لپکی۔ ناصر نے تیزی سے آگے بڑھ کر اسے تھام لیا۔ وہ چلائی "چھوڑ دو مجھے' ہاتھ نہ لگاؤ۔ میں کہتی ہوں چھوڑ دو۔ میں ایک پل یہاں رہنا نہیں چاہتی۔"

وہ بولا "کیا کرتی ہو پروین۔ تمہارا دماغ تو نہیں چل گیا۔ کیوں تماشا بنا رہی ہو؟ کہاں جاؤ گی اس وقت؟ پلیز پروین....."

"کہیں بھی جاؤں۔ میں یہاں نہیں رہوں گی" وہ چلا کر بولی۔

پتا نہیں اس میں اتنی ہمت کہاں سے آگئی تھی۔ وہ تو ہر ستم چپ چاپ سہ جانے والی چھوئی موئی سی لڑکی تھی۔ اس نے زور لگا کر خود کو ناصر کی گرفت سے چھڑانا چاہا تو ایک دم اس کے تیور بدل گئے...... اور صرف تیور ہی نہیں لہجہ بھی بدل گیا "ہوش کرو" وہ ایک اجنبی سے لہجے میں بولا۔ اس کے ہاتھوں کی گرفت ایک دم سخت ہوگئی اور اس نے پروین کو دھکا دے کر بستر پر پھینک دیا۔ بستر پر گرتے ہی وہ اٹھی اور پھر دروازے کی طرف لپکی۔ اس مرتبہ ناصر نے اس کے بال پکڑے اور رخسار پر زنانے دار تھپڑ مارا۔ وہی رخسار جن کی تعریفیں کرتے وہ تھکتا نہیں تھا' وہی بال جن کو وہ خوشبودار ریشم کہتا تھا۔ تھپڑ کھا کر پروین کی آنکھوں میں ستارے سے ناچ گئے۔ دوسرا تھپڑ پروین کے چہرے کے عین سامنے ناک اور ہونٹوں پر لگا۔ وہ پھر تیورا کر بستر پر جاگری۔ اس کے بعد تو جیسے

اس پر قیامت ٹوٹ گئی۔ ناصر نے گھونسوں اور لاتوں سے اسے روئی کی طرح دھنک کر رکھ دیا۔ وہ اٹھ رہی تھی گر رہی تھی، پھر اٹھ رہی تھی۔ کبھی دیواروں سے ٹکراتی تھی کبھی فرنیچر سے۔ اس کے حلق سے گھٹی گھٹی چیخیں نکل رہی تھیں۔ ناصر کا چہرہ کسی خونخوار درندے کا چہرہ نظر آ رہا تھا۔ اس کی آنکھیں حلقوں سے باہر ابلی پڑ رہی تھیں۔ وہ ہانپتے ہوئے لہجے میں دہاڑا "حرامزادی، خون پی جاؤں گا تیرا۔ ہڈیاں توڑ دوں گا۔ تیری یہ جرأت کہ ہاتھا پائی کرے مجھ سے۔"

وہ پروین کو بے دردی سے مارتا رہا، کوئی اسے چھڑانے نہیں آیا۔ اس کے کپڑے پھٹ گئے، وہ لہولہان ہو گئی اور ایک بار پھر ہوش و حواس کھو کر دنیا و مافیہا سے بے خبر ہو گئی۔

○☆○

ہوش میں آنے کے بعد پروین نے ناصر کا ایک نیا ہی روپ دیکھا۔ وہ ایک ایسے سفاک اور جابر شخص کے روپ میں اس کے سامنے آیا جو قانونی طور پر اس کا شوہر بھی تھا۔ اس نے پروین کو واضح الفاظ میں بتا دیا کہ اسے اس کے اشاروں پر چلنا ہوگا ورنہ وہ بہت برے حالات کا شکار ہو کر مرے گی۔ اس اجنبی ملک میں اجنبی لوگوں کے درمیان کون تھا جو اس کی مدد کرتا۔ ناصر ہر طرح اس پر حاوی تھا۔ وہ اسے سنگاپور سے تھائی لینڈ لے آیا۔ بدنام زمانہ شہر بنکاک میں ناصر کے ایک تھائی دوست کی کوٹھی پروین کا نیا مسکن ٹھہری۔ وہ خوبصورت تھی، جوان تھی اور سب سے بڑھ کر یہ کہ سحر انگیز جسمانی کشش کی مالک تھی۔ ناصر اس کی مدد سے لاکھوں کمانا چاہتا تھا۔ یوں وہ پروین پر بے حد مہربان تھا۔ اس کی ہر ضرورت کا خیال رکھتا تھا۔ اسے ہر طریقے سے خوش اور مطمئن رکھنے کی کوشش کرتا تھا بلکہ کبھی کبھی یہ دعویٰ بھی کرنے لگتا تھا کہ وہ اس سے محبت کرتا ہے لیکن دوسری طرف وہ اپنے اس فیصلے پر اٹل تھا کہ پروین کو گاہے گاہے اس کی مذموم خواہشات پوری کرنا ہوں گی۔ اس کے نزدیک یہ زندگی عیش و آرام سے جینے کے لیے تھی اور عیش و آرام کے حصول کے لیے کوئی سا بھی راستہ اختیار کرنا جائز تھا۔

پروین نے اس جال سے نکلنے کی بہت کوشش کی۔ آخر وہ ہار گئی۔ اس میں اتنی ہمت نہیں تھی کہ وہ خودکشی کر سکتی اور اس "بزدلی" کی سزا اسے یہ ملی کہ ایک رات اسے ایک امیر کبیر انڈین تاجر کے بستر کی زینت بننا پڑا۔

یہ تاجر گارمنٹس کا کام کرتا تھا اور اس سلسلے میں بنکاک آیا ہوا تھا۔ ناصر اسے گھیر گھار کر کوٹھی میں لے آیا۔ پھر پروین کو ہدایت کی کہ وہ اس کے پاس کمرے میں چلی جائے۔ حالات بڑے ظالم ہوتے ہیں۔ پروین تو پھر ایک ناتواں بے سہارا لڑکی تھی، بڑے بڑے فولادی انسان بتدریج حالات کے سانچے میں ڈھل جاتے ہیں اور انہیں خبر تک نہیں ہوتی۔ جن جان سے پیارے لوگوں کی جدائی کے بارے میں سوچا بھی نہیں جا سکتا وہ بستر علالت پر لیٹے ہیں اور پھر دھیرے دھیرے جاں بلب ہو جاتے ہیں۔ ایک وقت ایسا آتا ہے کہ ان کی زندگی اور موت میں کوئی خاص فرق ہی محسوس نہیں ہوتا.....

پروین کی "پاکیزگی" بھی بستر علالت پر لیٹی تھی اور چند ہفتوں میں جاں بلب ہو گئی تھی۔ اب اس سے جدائی کا وقت آیا تھا تو پروین کو کوئی خاص قلق ہی محسوس نہیں ہو رہا تھا۔ نہ اس پر کوئی قیامت ٹوٹی تھی نہ وہ پاگل ہوئی تھی، نہ روئی چلائی تھی۔ اپنی بدقسمتی کو تقدیر کا لکھا سمجھ کر اس نے خود کو ایک بے جان لاشے کی طرح ایک عیاش خریدار کے سامنے پھینک دیا تھا۔

ایک بار یہ سلسلہ شروع ہوا تو پھر دراز ہوتا چلا گیا۔ ناصر کی آنکھوں سے حجاب کا ہر پردہ اٹھ گیا۔ وہ بڑی شرمناک ڈھٹائی کے ساتھ ہر دوسرے تیسرے روز کسی "مہمان" کو گھر لانے لگا۔ ناصر کے اشارے پر پروین کو کسی کٹھ پتلی کی طرح حرکت کرنا پڑتی۔ اگر کسی وقت وہ احتجاج کا سوچتی تو اسے وہ مار یاد آتی جو ناصر نے اسے سنگاپور کے فلیٹ میں ماری تھی اور جس کے بعد وہ کئی دن بستر سے نہیں اٹھ سکی تھی۔ اس کا رواں رواں لرز جاتا اور وہ ڈر سہم کر اپنے آپ میں سمٹ جاتی۔ انسانوں کے جنگل میں ایک تنہا اور بے آسرا لڑکی کر بھی کیا سکتی تھی۔ اس پر ناصر اور اس کا تھائی دوست ہر وقت کڑا پہرا رکھتے تھے۔ اگر اسے کہیں جانا بھی ہوتا تھا تو ان دونوں میں سے ایک اس کے ساتھ ہوتا تھا اور پروین کو ہمہ وقت یوں محسوس ہوتا تھا جیسے وہ گن پوائنٹ پر چل پھر رہی ہے۔ پروین کئی ماہ اپنے باپ سے ملنے کے لیے تڑپتی رہی، پھر ایک روز اس کی یہ تڑپن ختم ہو گئی۔ سچ کہتے ہیں کہ غم کا حد سے گزر جانا دوا ہو جاتا ہے۔ اپنے بچھڑے باپ کا غم بھی آخر پروین کے لیے دوا بن گیا تھا۔ ناصر نے پروین کو پاکستان سے آنے والا ایک خط لا کر دیا۔ یہ خط سنگاپور کے پتے پر آیا تھا اور پروین کے ایک دور دراز کے چچا نے لکھا تھا۔ اس خط میں پروین کے باپ کی موت کی اطلاع تھی۔

چند روز پروین ساون بھادوں کے بادلوں کی طرح روئی پھر دھیرے دھیرے اسے صبر آ گیا۔ اس کے ذہن کے کمپیوٹر میں یہی پروگرام فیڈ تھا کہ جب دیار غیر میں اسے اپنے باپ کے مرنے کی روح فرسا اطلاع ملے گی تو وہ دو تین ہفتے رونے رلانے کے بعد قرار پا جائے گی۔ اس واقعے کے بعد وہ کچھ اور بے حس ہو گئی، کچھ اور خاموش ہو گئی۔ اس نے جیسے بڑی لاتعلقی سے خود کو زندگی کے دھارے میں پھینک دیا تھا۔ وہ اسے جہاں بھی چاہے لے جاتا۔

کبھی کبھار پروین آئینہ دیکھتی تو اسے عجیب سا لگتا۔ یوں محسوس ہوتا جیسے اس کے چہرے پر گناہ کی کالک کا چھوٹا سا داغ بھی نہیں ہے۔ اسے اپنے چہرے پر وہی معصومیت اور شادابی نظر آتی جو گناہ کی دلدل میں گرنے سے پہلے تھی۔ وہ سوچتی اس طرح کی زندگی گزارنے والوں کے چہرے ایسے تو نہیں ہوتے۔ شاید یہ اس کی خوش نظری تھی، یا پھر یہ بات تھی کہ وہ گناہ کی دلدل میں گر کر

sPK.com

...ت میں لتھڑ کر بھی اندر سے پاک صاف تھی۔ اس کا ... کملا گیا تھا لیکن اس کی روح اب تک شبنم، دھوپ، ... ہوا صبا کی طرح شفاف تھی۔

... ایک سال اسی طرح گزر گیا۔ دھیرے دھیرے ناصر اس پر ... نرم کرنے لگا۔ کبھی کبھی وہ اسے کسی قابلِ اعتماد کا کے ... باہر بھی بھیج دیتا تھا۔ ایک دوبار وہ اکیلی بازار بھی گئی۔ ... ت اب ناصر کو یقین ہو چلا تھا کہ وہ کہیں نہیں جائے گی۔ وہ ... پیچ اور طاقت کا اندازہ لگا چکی تھی اور جان چکی تھی کہ اس ... توڑنا اس کے بس میں نہیں ہے... اور ناصر کی یہ سوچ ایسی ... بھی نہیں تھی۔ چھوٹی سوئی سی پروین اتنا کچھ بیت جانے پر بھی ... سوئی ہی تھی۔ اس میں اتنا دم خم ہی نہیں تھا کہ وہ کوئی بڑا ... کر سکتی۔ بڑا فیصلہ تو کجا ناصر کی قوتِ تسخیر کا ہدف بننے کے بعد وہ ... فیصلہ کرنے میں بھی دشواری محسوس کرتی تھی۔ ناصر کے ... اس کا رویہ ابھی تک وہی تھا جو ایک سخت گیر شوہر کے ... لاچار بیوی کا ہوتا ہے۔ شاید لاشعوری طور پر وہ ناصر کو ابھی ... اپنا شوہر ہی سمجھتی تھی۔ جس گھر میں وہ ناصر کے زیرِ سایہ رہتی ... اس کی پناہ گاہ تھا۔ یہ پناہ گاہ کیسی بھی تھی۔ پناہ گاہ تو تھی۔ ... اس چار دیواری سے باہر ہر طرف بھیڑیے نظر آتے تھے۔ چیر ... نے اور خون پینے والے بھیڑیے۔ پروین کا رابطہ اپنے ماضی ... کل کٹ چکا تھا۔ اس نے کئی بار ان لوگوں کو یاد کیا تھا جنہوں ... اس کا رشتہ طے کرایا تھا۔ اس نے کئی بار اپنے سسرالی رشتے ... کو یاد کیا تھا۔ لیکن ان میں سے کوئی اس کے حال میں ... نہیں آیا تھا۔ ایک بار ناصر نے صرف اتنا بتایا تھا کہ وہ ... والدین سے قطع تعلق کر چکا ہے۔

ایک روز ناصر شام کے بعد ایک خوش پوش مہمان لے کر ... مہمان کو دیکھ کر پروین کی آنکھیں کھلی رہ گئیں... وہ شیراز احمد ... پینٹ قمیص پہنے ہوئے، ٹائی لگائے ہوئے اور چمکدار بوٹ پہنے ... اس نے آستینیں کہنیوں تک چڑھا رکھی تھیں اور اس کے ... کے سیاہ بال بہت بھلے لگ رہے تھے۔ اسے اپنی نگاہ پر یقین ... کیا۔ شاید وہ کوئی بھولا بسرا خواب دیکھ رہی تھی۔ کہاں لاہور ... کہاں یہ شہر خرابی بنکاک۔ شیراز احمد نے گھوم کر اس کی طرف ... اس کی شربتی آنکھوں میں ہلکا ہلکا نشہ تھا۔ گداز ہونٹ ... سے ایک دوسرے پر جمے ہوئے تھے۔ سگریٹ کا کش لے ... نے بغور پروین کو دیکھا۔ اس کی آنکھوں میں پسندیدگی کی ... نظر آنے لگی۔ تاہم اس جھلک میں ہلکی سی حیرانی بھی شامل ... غالباً وہ اس بات پر حیران ہو رہا تھا کہ خوبصورت ساری میں ... ہوئی یہ نرم و نازک لڑکی اندر آتے آتے رک کیوں گئی ہے اور ... آنکھیں پھٹ پھٹا کر اس کی طرف کیا دیکھ رہی ہے۔

"اندر آجاؤ" اس نے مردانہ کشش سے بھرپور آواز میں

پروین میکانکی انداز میں چل کر اندر داخل ہو گئی۔

"بیٹھ جاؤ" اس نے صوفے کی طرف اشارہ کیا۔

پروین بیٹھ گئی۔ سامنے تپائی پر وہسکی اور گلاس وغیرہ رکھے تھے۔ کمرا ائر فریشنر کی خوشبو سے مہکا ہوا تھا۔ فضا میں سگریٹ کے دھوئیں کی آمیزش تھی۔ سب کچھ ویسا ہی تھا جیسے پہلے ہوتا تھا، لیکن آج کچھ اور طرح محسوس ہو رہا تھا۔ اس کا محبوب اس کے سامنے تھا۔ وہی کشادہ سینہ، بھرے بھرے بازو، روشن پیشانی کے نیچے دو سوچ میں ڈوبی ہوئی آنکھیں اور حاصلِ غزل شعر جیسے دو گداز ہونٹ۔ پروین نے کبھی خواب میں بھی نہ سوچا تھا کہ ایسا ہو گا۔ اس کا محبوب اس کی زندگی میں اس وقت آئے گا جب وہ شادی شدہ ہو گی اور اس کا شوہر خود اسے اپنے رقیب کی خلوت میں بھیجے گا۔ وقت کی بساط پر حالات نے یہ کیسی کروٹ بدلی تھی؟ آج کی رات وہ چہرہ اس کے سامنے تھا جو اس کے دل کا داغ تھا اور "اس چہرے" اور پروین کے درمیان کوئی چیز حائل نہیں تھی۔

"تم انڈین ہو؟" شیراز احمد کی آواز نے اسے چونکایا۔

"نہیں پاکستانی۔"

"کیا نام ہے؟"

"گل" پروین نے وہی نام بتایا جو وہ ایسے موقعوں پر بتایا کرتی تھی۔

"ایک جام بناؤ گی؟" شائستگی سے پوچھا گیا۔

پروین نے بوتل اور پیالے کی طرف دیکھا۔ وہ پہلے بھی جام بنا کر اپنے "شریکِ شب" کو دیا کرتی تھی لیکن آج اسے اس کام سے جھجک سی محسوس ہو رہی تھی۔ معلوم نہیں ایسا کیوں تھا۔ اس نے اپنے لرزاں ہاتھ بوتل کی طرف بڑھائے اور جام بنا دیا۔ شیراز احمد کا ہاتھ اس کے شانے پر تھا۔ وہ اس لمس کو اپنے دل کی گہرائیوں سے محسوس کر رہی تھی۔ ایک عجیب سی بے خودی کے زیرِ اثر اس کی آنکھیں بند ہونے لگیں۔ اسے لگا جیسے وہ تین چار برس پیچھے چلی گئی ہے، وہی الھڑ دوشیزہ بن گئی ہے جو اپنے محبوب کی کتاب سینے پر رکھ کر سوتی تھی۔ اسے محبت بھرے گمنام خط لکھتی تھی اور پہروں اس کی یاد میں کھوئی رہتی تھی۔ اس کا سر آپوں آپ شیراز احمد کے شانے سے چھونے لگا... لیکن پھر نجانے یکدم اسے کیا ہوا کہ وہ جھجک کر پیچھے ہٹ گئی۔ شیراز احمد چونک کر اس کی طرف دیکھنے لگا۔ پروین اپنی جگہ سے اٹھی اور دوڑتی ہوئی باہر نکل آئی۔ معلوم نہیں اچانک کیا ہو گیا تھا اسے؟ ناصر ٹی وی لاؤنج میں بیٹھا ٹی وی دیکھ رہا تھا۔ اس نے پروین کو یوں بھاگ کر کمرے سے نکلتے دیکھا تو اس کے پاس آگیا "کیا بات ہے پروین؟" لٹکتے ہوئے لہجے میں پوچھا۔

"میں نہیں جاؤں گی" وہ نفی میں سر ہلاتے ہوئے بولی۔

"کچھ کہہ دیا اس نے؟" وہ نئے اندیشے کے تحت بولا۔

"نہیں اس نے کچھ نہیں کہا۔ بس میں نہیں جاؤں گی۔"

س گل آج شام سیڑھیوں سے پھسل گئی تھیں۔
رام کرلیں۔ کہنے لگیں نہیں۔ مسٹر شیراز کو اس روز
ستا ہوا تھا۔ آج ضرور جاؤں گی۔"
و شیراز احمد کے پاس چھوڑ کر ناصر باہر چلا گیا۔ شیراز
اپنے لیے خود ہی پیگ بنایا اور ادھر ادھر کی باتیں کرتا
نے پروین کو پیش آنے والے حادثے پر اظہار افسوس
یہ کہا کہ وہ آج آرام کرے، وہ پھر کسی دن آئے گا۔
ن نے اسے جانے سے روک لیا۔ یہ بھی ناصر ہی کا حکم
نے پروین کو بے حد سختی سے ہدایت کی تھی کہ "مہمان" کو
نہیں لوٹنا چاہیے....
از احمد پروین کے اصرار پر حیران تھا۔ اس نے سگریٹ کا
لیتے ہوئے کہا "اگر تم بضد ہو تو ہم کہیں باہر گھومنے چلتے
مطلب ہے پورٹ کی طرف۔ میں تمہارے گارجین سے
لے لیتا ہوں۔"

ن میرا پاؤں ٹھیک نہیں" پروین نے عذر پیش کیا۔
ی ہمیں کون سا پیدل چلنا ہے۔ میری گاڑی باہر کھڑی ہے'
جائیں کے گاڑی پر آجائیں گے۔"
ین کی خاموشی کو نیم رضامندی جان کر شیراز احمد نے ناصر
کی اور اس سے اجازت لے کر پروین کو باہر اپنی گاڑی
آیا۔ وہ شہر کی نیم سنسان سڑکوں پر چکراتے ہوئے ساحل
بڑھنے لگے۔ شیراز احمد دلنشیں لہجے میں اس سے ہلکی پھلکی
ی کرتا جا رہا تھا۔ وہی گفتگو وہی لہجہ جس کے لیے کبھی اس
ترسا کرتے تھے.... شیراز احمد کو اس بات میں شبہ تھا کہ
چانک سیڑھیوں سے گر گئی ہے اور یہ کہ اس دن وہ طبیعت
ہونے کے باعث کمرے سے چلی گئی تھی۔ وہ حقیقت جانتا
۔ پروین اسے حقیقت کیسے بتاتی۔ کیسے کہتی کہ وہ گناہ کی
دلدل میں دھنس کر بھی گناہ سے بہت دور تھی کیونکہ وہ جو کچھ کرتی
وری کے تحت کرتی تھی لیکن اب شیراز سے ملتے ہوئے اسے
ہو رہا تھا کہ اس کی مجبوری میں کسی نہ کسی درجے کی مرضی
ل ہو رہی ہے اور یہی اس کے نزدیک گناہ تھا۔ وہ اس گناہ
بھاگنا چاہ رہی تھی لیکن ناصر کسی عفریت کی طرح اس کا
و کے کھڑا تھا۔ وہ یہ سب کچھ شیراز احمد کو نہیں بتا سکتی تھی
اس نے بہت سی وضاحتوں اور ڈھیر ساری دروغ گوئی کے
شیراز احمد کو مطمئن کردیا۔ معلوم نہیں وہ پوری طرح مطمئن
نہیں تاہم اس نے اس حوالے سے مزید کوئی بات نہیں کی....
کا رخ بتدریج اپنی طرف لے گیا۔ پروین جانتی تھی شیراز احمد
و شاعری نہیں، صاف گو انسان بھی ہے۔ پروین کی توقعات
مطابق شیراز نے اپنے بارے میں بتاتے ہوئے بہت صاف
سے کام لیا۔ وہ اسے اپنے مشاغل اپنی مصروفیات اور اپنی
زندگی کے بارے میں بتا رہا تھا۔ وہ کہیں بھی مبالغے سے کام

نہیں لے رہا تھا۔ بحیثیت شاعر بھی اس نے اپنا رتبہ بڑھا چڑھا کر بیان کرنے کی کوشش نہیں کی۔ جو کچھ وہ بتا رہا تھا اس میں سے بہت سی باتیں پروین پہلے سے جانتی تھی۔ بہر حال کچھ باتیں نئی بھی تھیں۔ شیراز احمد نے بتایا کہ ایک سال پہلے اس کی شادی ہوئی تھی۔ شادی کے تین چار ماہ بعد ہی میاں بیوی کے تعلقات بگڑ گئے اور اس نے بیوی کو طلاق دے دی۔ زندگی بہت گھٹن کا شکار تھی۔ وہ شب و روز کی تلخیاں شراب میں گھول کر پینے کی کوشش کرتا تھا اور کبھی کبھی دھوپ کے مسلسل سفر سے تھک کر کسی کی زلفوں کی گھنی چھاؤں تلاش کرنے لگتا تھا۔ وہ یہاں تھائی لینڈ میں کسی ادبی سیمینار میں شرکت کے لیے آیا ہوا تھا.... اور سیمینار کے بعد بھی ڈیڑھ دو ماہ اسے یہیں قیام کرنا تھا۔ یہاں وہ گارمنٹس کے کاروبار میں کسی سرور اجی کا پارٹنر تھا۔

آؤٹنگ کے بعد شیراز احمد پروین کو واپس ناصر کے پاس چھوڑ گیا۔ پروین اپنے دل میں ہلکی سی کسک لے کر واپس آئی تھی۔ پروین اور شیراز احمد کی اگلی ملاقات چار پانچ روز بعد ہوئی۔ وہ ہفتے کی رات تھی۔ ہفتے کی رات کو ناصر اور اس کا تھائی دوست خوب پیتے تھے اور ان کی آنکھیں رات گئے تک سرخ انگارا رہتی تھیں۔ اس رات بھی ناصر جھومتا پھر رہا تھا۔ شیراز احمد آیا تو اس کی باچھیں کھل گئیں۔ ایک موٹی رقم ملنے کی توقع جو پیدا ہو گئی تھی۔ اس نے پروین کو کامدار بنارسی ساری پہننے کا حکم دیا اور جب وہ تیار ہو گئی تو شیراز احمد کے پاس بھیج دیا۔ شیراز احمد کی طرف

حکیمی ٹیکسی
گھر کی مرغی
شرارت
بے وقوف

... اس نے پیسے دیے ہیں۔ وہ بھلا مانس آدمی ہے۔ اگر اس نے کوئی ایسی ویسی بات کی ہے تو... میں اسے سمجھا دیتا ہوں۔"

"میں نے کہہ دیا نا۔ اس نے کچھ نہیں کہا۔ لیکن میں نہیں جاؤں گی" وہ بلند آواز میں بولی۔ ایک برس کے بعد پہلی بار اس کے لہجے میں ہلکی سی خود سری داخل ہوئی تھی۔

ناصر نے گھور کر اسے دیکھا پھر کمرے کا دروازہ اندر سے بند کرلیا "میرا خیال ہے تیرے دماغ میں پھر کوئی کیڑا کلبلا رہا ہے" وہ درشت لہجے میں بولا۔

"میری طبیعت ٹھیک نہیں ہے" پروین نے عذر تراشا۔

"دس منٹ میں تیری طبیعت کو کیا ہو گیا" وہ غرایا۔

"میں نے کہہ دیا نا... مجھے اکیلا چھوڑ دو" وہ بولی۔

ناصر نے سختی سے اس کی کلائی تھام لی "چل پروین اس کے پاس جا۔ خوامخواہ میرا دماغ گھمانے کی کوشش نہ کر۔"

پروین نے خود کو چھڑانے کی کوشش کی تو ناصر نے زناٹے کا تھپڑ اس کے گال پر جڑ دیا۔ وہ لڑکھڑا کر دیوار سے جا لگی۔ ناصر نے اس کے بال کھینچے اور تین چار مزید تھپڑ رسید کیے۔ پھر زور سے دھکا دے کر قالین پر گرا دیا۔ وہ جہاں گری تھی وہیں پڑی روتی رہی۔ ناصر نے دروازہ کھول کر زور سے بند کیا اور پاؤں پٹختا ہوا اس کمرے کی طرف چلا گیا جہاں شیراز احمد بیٹھا تھا۔

دو تین روز ناصر اور پروین میں بول چال بالکل بند رہی۔ ناصر کمرے میں بیٹھا سگرٹ پھونکتا رہتا یا وسکی پیتا رہتا۔ پروین گھر کے کام کاج میں لگی رہتی یا اپنے کمرے میں جا کر لیٹ جاتی۔ تیسرے روز شام کو ناصر کے تھائی دوست نے ان دونوں کی صلح کرادی۔ بعد میں ناصر پروین کو گھمانے کے لیے باہر بھی لے کر گیا۔ ایک پاکستانی ریستوران سے کھانا کھا کر وہ رات نو بجے کے قریب واپس آئے۔ جب پروین سنگار میز کے سامنے بیٹھ کر اپنے بُندے اتارنے لگی' ناصر جلدی سے بولا "رہنے دو۔"

"کیوں؟"

"کوئی آرہا ہے۔"

پروین ایک طویل ٹھنڈی سانس لے کر سنگار میز کے سامنے سے اٹھ گئی۔ وہ ناصر کا اشارہ سمجھ رہی تھی۔ آج شب پھر اسے کسی "مہمان" کو خوش آمدید کہنا تھا۔

"یہ نہیں پوچھو گی کون آرہا ہے؟" ناصر نے دریافت کیا۔

"کون آرہا ہے؟"

"وہی تین دن پہلے والا مہمان۔"

ایک دم پروین کی پیشانی پر بل پڑ گئے۔ وہ چلا کر بولی "ناصر! میں نے تم سے کہہ دیا ہے' میں اس کے پاس نہیں جاؤں گی... مجھے... نہیں اچھا لگتا ہے وہ۔"

"کیوں اچھا نہیں لگتا؟" ناصر کے لہجے میں ضد اور خود سری عود کر آئی۔

"بس نہیں لگتا۔ تم اس کی رقم واپس کردو۔ میں منت کرتی ہوں تمہاری۔"

"تم ضد کررہی ہو پروین۔"

"ضد تم کررہے ہو۔"

"چلو اچھا' ضد ہی سہی۔ کیا تم میری یہ ضد پوری نہیں کرو گی۔"

"نہیں ناصر" وہ کراہی۔

"کیوں نہیں؟"

"بس میرا دل نہیں چاہتا۔"

"کیوں نہیں... کیوں نہیں؟" اس نے اسے شانوں سے پکڑ کر جنونی انداز میں جھنجوڑا پھر بے دریغ پیٹنے لگا۔ چند تھپڑ مار کر اس پر وہی وحشت سوار ہوگئی جو سنگاپور کے فلیٹ میں ہوئی تھی۔ اس نے پروین پر گھونسوں اور لاتوں کی بارش کردی۔ وہ اسے اٹھا کر دیواروں سے مار رہا تھا' فرش پر پٹخ رہا تھا۔ اور غلیظ ترین گالیاں دے رہا تھا۔ ساتھ ساتھ وہ یہ بھی پوچھ رہا تھا "جائے گی کہ نہیں... جائے گی کہ نہیں؟"

آخر پروین نیم بے ہوش ہو کر فرش پر گر گئی۔ ناصر نے اپنی جیکٹ کے اندر سے چمکدار پسٹل نکالا اور اس کی سرد نال پروین کی خون آلود پیشانی سے لگا کر بولا "تو جائے گی اور سر کے بل جائے گی۔"

پروین کے بازوؤں اور ٹانگوں پر چوٹیں آئی تھیں تاہم کوئی زخم وغیرہ نہیں لگا تھا۔ زخم صرف سر پر لگا تھا اور سر سے بہنے والا خون اس کے تین چوتھائی چہرے کو بھگو رہا تھا۔ ایک پاؤں سے بھی شدید ٹیسیں اٹھ رہی تھیں۔ ناصر نے اسے گریبان سے کھینچ کر اٹھایا اور دھکیل کر باتھ روم میں لے گیا۔ وہ سرتاپا کانپ رہی تھی۔ ناصر نے ٹھنڈے پانی کا نل کھول کر اس کا سر نیچے رکھ دیا۔ خون بند ہوا تو اس نے "اسپرے" کرنے کے بعد چھوٹی سی بینڈیج کردی۔ پسٹل اس نے ابھی تک جیکٹ میں واپس نہیں رکھا تھا۔ وہ سامنے تپائی پر پڑا تھا اور بہ زبانِ خاموشی پروین کو سنگین ترین نتائج کی دھمکیاں دے رہا تھا۔ ناصر نے اسے لباس تبدیل کرنے کا حکم دیا اور کہا کہ وہ اپنا حلیہ درست کرے۔ خود وہ پسٹل لے کر سامنے صوفے پر جا بیٹھا۔ پروین جانتی تھی کہ وہ بظاہر پُرسکون ہے لیکن اندر سے آتش فشاں کی طرح بھڑک رہا ہے اور اس نے مزاحمت کا ذرا سا اشارہ بھی دیا تو وہ پھر دیوانوں کی طرح اس پر پل پڑے گا۔ وہ چُور چُور جسم کے ساتھ لنگڑاتی ہوئی ڈریسنگ روم میں چلی گئی۔

ڈیڑھ دو گھنٹے بعد "مہمان" بھی آن وارد ہوا۔ حسبِ توقع وہ شیراز احمد ہی تھا۔ پروین کے سر پر پٹی اور زرد رنگت دیکھ کر وہ چونکا۔ ناصر نے وضاحت پیش کرتے ہوئے کہا "معذرت چاہتا

جاتے ہوئے پروین کا دل الو کے انداز میں دھڑک رہا تھا۔

پروین نے ایسی بہت سی گناہ آلود راتیں گزاری تھیں لیکن ایسی ہر گناہ آلود رات کی صبح وہ یوں شفاف نظر آتی تھی جیسے یہ رات اس پر نہیں کسی اور پر گزری ہے۔۔۔۔ آج پہلی بار اسے محسوس ہو رہا تھا کہ اس نے کوئی گناہ کیا ہے۔ کوئی قیمتی چیز اس سے چھن گئی ہے۔ صبح کی نماز بچپن سے پروین کی عادت میں شامل تھی۔ وہ کیسے کیسے حالات اور کیسی کیسی کیفیات سے گزری تھی لیکن یہ عادت کبھی چھوٹی نہیں تھی۔ یہاں تک کہ پچھلے ایک برس کی گناہ آلود زندگی میں بھی اس نے میکانکی طور پر یہ عمل جاری رکھا تھا لیکن آج پہلی بار وہ بلا عذر دن چڑھے تک بستر پر پڑی رہی۔ جب اس کی آنکھ کھلی تو "شریکِ شب" رخصت ہو چکا تھا اور ناصر یا اس کے تھائی دوست نے اندر آ کر کھڑکیوں پر سے پردے ہٹا دیے تھے۔

وال کلاک صبح دس بجے کا وقت بتا رہا تھا۔ وہ یونہی پہلو کے بل لیٹی کھڑکی سے باہر دیکھتی رہی۔ وہ آج خود کو ایک بدلی ہوئی عورت محسوس کر رہی تھی۔ کوئی نیا پن تھا جو اس کے اندر پیدا ہو چکا تھا۔ شاید یہ نیا پن اس گناہ کی دین تھا جو آج اس سے سرزد ہوا تھا۔

○☆○

ناصر کو یقین نہیں آ رہا تھا کہ پروین ایسی جرأت کر سکتی ہے۔ وہ تو اس کی اجازت کے بغیر کھڑکی سے باہر نہیں جھانکتی تھی۔ کہاں یہ کہ بازار جاتی اور واپس نہ آتی۔ وہ آج دوپہر ناصر سے اجازت لے کر ملازمہ نینگ کے ساتھ تھوڑی سی شاپنگ کے لیے گئی تھی۔ نینگ کو کچھ سامان دے کر اس نے ٹیکسی کی طرف بھیجا۔ جب نینگ ٹیکسی میں سامان رکھ کر واپس آئی تو پروین غائب تھی۔ نینگ نے بہت تلاش کیا لیکن کچھ پتا نہیں چلا۔ اس نے ناصر کو ٹیلی فون کر دیا۔ ناصر بھی موقع پر جا کر بہت دیر جھک مارتا رہا۔ آخر جھنجلایا ہوا گھر لوٹ آیا۔ وہ اگلے اقدام سے پہلے اپنے تھائی دوست شاؤ سے مشورہ کرنا چاہتا تھا۔ پہلے تو ان دونوں کا خیال تھا کہ پروین کو کسی نے اغوا کر لیا ہے لیکن جب انہوں نے پروین کے سامان کی تلاشی لی تو زیورات اور نقدی غائب پائے۔ ناصر اور اس کا دوست سناٹے میں رہ گئے۔ اب اس بات میں شبہے کی گنجائش نہیں تھی کہ پروین اپنی مرضی سے اور پروگرام کے تحت گئی ہے۔ ناصر حیران تھا۔ ایک دم اتنی جرأت کہاں سے آ گئی اس نازک اندام' بے زبان لڑکی میں؟

سوچ بچار کے بعد ناصر اس نتیجے پر پہنچا کہ ضرور پروین اور شیراز احمد میں کوئی گٹھ جوڑ پیدا ہوا ہے۔ ناصر کو یاد آنے لگا کہ شیراز احمد سے آخری دو تین ملاقاتوں میں پروین کافی بے تکلف نظر آتی تھی اور شیراز احمد کو دیکھتے ہی اس کی آنکھوں میں ایک بے نام آمادگی ابھر آتی تھی۔ اس نے شیراز احمد پر دانت پیسے اور ووڈکا کا آدھا گلاس ہونٹوں سے لگا کر خالی کر گیا۔ وہ کچی گولیاں نہیں کھیلا

تھا۔ اپنے کسٹمرز کے بارے میں اسے اکثر بنیادی معلومات حاصل رہتی تھیں۔ خاص طور سے وہ جس کسٹمر کے ساتھ پروین کو آؤٹنگ پر بھیج دیتا تھا اس کا تمام "ڈاٹا" اس کو معلوم ہوتا تھا۔۔۔ اسے معلوم تھا کہ شیراز احمد گلاب سنگھ نامی شخص کا ساجھے دار ہے اور گلاب سنگھ ریڈی میڈ گارمنٹس کا کاروبار کرتا ہے۔ گلاب سنگھ کی ایک دکان ڈیلکس مارکیٹ میں تھی۔

ناصر نے بہت جلد شیراز احمد کا سراغ لگا لیا۔ لیکن گلاب سنگھ اپنے کسی کام سے انڈیا گیا ہوا تھا۔ جونہی وہ انڈیا سے واپس آیا' ناصر نے شیراز احمد کا گھر ادبا لیا۔ وہ پچھلے تین چار ہفتے سے بنکاک کے ایک نواحی قصبے "سونگی وان" میں مقیم تھا۔ سونگی وان ایک خوبصورت قصبہ تھا اور سیاح قدرتی مناظر اور پُرسکون ماحول کے لیے اس قصبے کا رخ کرتے تھے۔ ناصر اور اس کے تھائی دوست نے شیراز احمد کو ایک چھوٹی سی بنگلا نما کوٹھی میں جا لیا۔ یہ کوٹھی گلاب سنگھ کے کسی رشتے دار کی تھی۔ وہ دوپہر کا وقت تھا۔ شیراز احمد کوٹھی کے اکلوتے بیڈ روم میں محو خواب تھا۔ ان دونوں نے اسے سوتا رہنے دیا اور کوٹھی کے دیگر حصوں میں گھوم پھر کر دیکھا۔ پروین کہیں نہیں تھی۔ ہاں چند ایسے آثار ضرور نظر آئے جن سے اندازہ ہوا کہ کوئی لڑکی ایک دو روز پہلے تک یہاں موجود تھی۔

ناصر نے ایک زوردار ٹھوکر کے ذریعے شیراز احمد کو خوابِ خرگوش سے بیدار کیا۔ وہ ان دونوں کو اپنے سامنے دیکھ کر ششدر رہ گیا۔ ناصر نے اسے بتایا کہ وہ دیوار پھلانگ کر آئے ہیں اور پوچھا کہ گل کہاں ہے؟

شیراز احمد نے پہلے تو لاعلمی کا اظہار کیا لیکن جب ناصر نے گریبان سے پکڑ کر جھنجوڑا اور لال پیلی آنکھیں دکھائیں تو وہ سمجھ گیا کہ شدید قسم کی "بے عزتی" اس کے دروازے پر دستک دینے والی ہے۔ سمجھداری کا ثبوت دیتے ہوئے اس نے ناصر اور شاؤ سے نرم لہجہ اختیار کیا اور ساری بات کھول کر بتا دی۔

اس نے کہا "پچھلے مہینے گل نے خود مجھ سے رابطہ کیا تھا۔ اس کا فون آیا تھا۔ اس نے کہا کہ وہ شہر کے ماحول سے بہت اکتا گئی ہے اور چند دن کسی پُرسکون جگہ پر گزارنا چاہتی ہے۔ میں نے کہا' میں حاضر ہوں' تم اپنے گارجین سے اجازت لے لو۔ وہ بولی' اجازت لینا یا نہ لینا میرا مسئلہ ہے' تم میرے ساتھ وقت طے کر لو۔ میں مقررہ وقت پر تمہیں وہیں ملوں گی پھر ہم چند دن کے لیے کہیں دور نکل جائیں گے۔ میں نے اس سے دو روز بعد کا وقت اور مقام طے کر لیا۔ وہ مجھ سے مقررہ وقت پر ملی اور ہم خاموشی سے اس قصبے میں آ گئے۔ اس کوٹھی میں میں نے گل کے ساتھ ایک مہینہ گزارا ہے۔ وہ بے حد عجیب اور سیلانی لڑکی ہے۔ وہ چاہتی تھی کہ میں اس سے شادی کر لوں" ایک لمحہ توقف کر کے شیراز احمد نے سگریٹ سلگایا اور شاعرانہ انداز میں کش لیتے ہوئے بولا "میں نے ان دونوں سے وعدہ کیا ہے کہ سب کچھ کھول کر بتا دوں گا اور

چھپاؤں گا نہیں۔ یہ حقیقت ہے کہ میں خود بھی اس لڑکی کے سحر میں جکڑا جا چکا تھا۔ میں نے فیصلہ کرلیا کہ اس سے نکاح کروں گا اور جیسے بھی ہو سکا اسے گناہ کے ماحول سے نکالنے کی کوشش کروں گا۔ لیکن پھر نجانے کیا ہوا کہ وہ خود ہی اپنے موقف پر قائم نہ رہی۔ مجھ سے کہنے لگی۔ ہماری خواہشوں کی بیل منڈھے نہیں چڑھ سکے گی۔ میں ایک گناہ گار عورت ہوں۔ میں اپنی بدکاری کی سیاہی سے آپ کا اجلا دامن میلا کرنا نہیں چاہتی۔ میرا مقدر اب یہی ہے کہ میں بنکاک کے اندھیروں میں بھٹکتی رہوں۔ میں نے اسے سمجھانے کی بہت کوشش کی لیکن وہ جیسے کسی خول میں چھپ کر بیٹھ گئی تھی۔ دو روز پہلے جب میں صبح اٹھا تو سائیڈ ٹیبل پر تازہ پھولوں کا ڈھیر لگا تھا۔ وہ جا چکی تھی۔"

"اب وہ کہاں ہے؟" ناصر نے پوچھا۔

"زیادہ دور نہیں" شیراز نے جواب دیا۔

"کیا مطلب؟" ناصر چونک گیا۔

"وہ سامنے ایک کوٹھی کی سرخ چھت دیکھ رہے ہو تم" شیراز احمد نے کھڑکی میں سے دور اشارہ کیا۔ ناصر نے شیراز احمد کی نظروں کا تعاقب کیا تو کوئی فرلانگ بھر دور سرخ چھت نظر آئی۔ شیراز احمد بولا "وہ اسی کوٹھی میں ہے۔ کسی یورپین کے ساتھ ٹھہری ہوئی ہے۔ کل شام اتفاقاً میری نظر پڑ گئی۔ وہ مین گیٹ کے سامنے ایک ہنڈا کار میں سے نکل رہی تھی۔ مجھے دیکھ کر ٹھٹک گئی۔ میں اس سے بات کرنا چاہتا تھا' تیزی سے آگے بڑھا تو وہ گیٹ سے گزر کر اندر چلی گئی۔ میں بہت دیر گیٹ کے سامنے ٹہلتا رہا۔ کچھ سمجھ میں نہیں آرہا تھا کہ اس سے کیسے رابطہ کروں۔ آج صبح میں پھر اس کوٹھی کی طرف چلا گیا۔ کچھ دیر ادھر ادھر ٹہلتا رہا پھر کال بیل پر انگلی رکھنے کا ارادہ ہی کر رہا تھا کہ وہ باہر نکل آئی۔ کہنے لگی' شاید آپ مجھ سے کچھ کہنا چاہتے ہیں۔ میں نے اثبات میں جواب دیا۔ وہ بولی' لیکن پہلے میری ایک بات سن لیجئے۔ میں نے آپ کے ساتھ کچھ بہت اچھے دن گزارے ہیں۔ میں چاہتی ہوں یہ دن جیسے گزرے ہیں ویسے ہی مجھے ہمیشہ یاد رہیں۔ پلیز میری یہ خواہش پوری کر دیجئے۔۔۔ آئندہ مجھ سے ملنے کی کوشش نہ کیجئے۔۔۔ اس کے لہجے اور انداز نے کچھ کہنے سننے کی گنجائش ہی نہیں رکھی تھی میں خاموشی سے واپس آگیا۔"

شیراز احمد نے بات ختم کی تو ناصر اور اس کا دوست حیرانی سے اس کی طرف دیکھ رہے تھے۔

○☆○

ناصر اور اس کا دوست' شیراز احمد کے پاس سے اٹھے تو سیدھے اس سرخ چھت والی کوٹھی پر پہنچے۔ ناصر کا چہرہ غم و غصے سے بگڑا ہوا تھا۔ اسے یقین نہیں آرہا تھا کہ پروین اس حد تک جا سکتی ہے۔ وہ اس کے لیے سونے کی چڑیا تھی۔ یہ چڑیا یوں ایک دم اڑ جائے گی اس کے خواب و خیال میں بھی نہ تھا۔ اس نے کال بیل کا بٹن دبایا۔ ایک ملازم لڑکے نے چھوٹا گیٹ کھولا۔ ناصر کو پروین سامنے ہی نظر آگئی۔ وہ سرسبز لان پر ایک دیدہ زیب کرسی پر بیٹھی کوئی میگزین دیکھ رہی تھی۔ پروین کو دیکھ کر ناصر کو اپنے غصے پر قابو نہ رہا۔ وہ یہ بھی بھول گیا کہ وہ کسی کے گھر میں بلا اجازت داخل ہو رہا ہے۔۔۔ جیسے کوئی اپنے مسروقہ مال کو پہچان کر اس کی طرف جھپٹتا ہے وہ بھی پروین کی طرف جھپٹا۔ ناصر کو دیکھ کر ایک لمحے کے لیے پروین کی رنگت متغیر ہوئی اور یوں لگا کہ وہ چیخ پڑے گی لیکن پھر وہ ایک دم تن کر کھڑی ہو گئی "کیا بات ہے؟" اس نے سخت لہجے میں پوچھا۔

"چلو گھر" ناصر دہاڑا۔ اس کے ساتھ ہی اس کا ہاتھ پروین کی کلائی کی طرف بڑھا۔

پروین نے جھٹک کر اپنا ہاتھ چھڑایا اور چیخ کر بولی "تم ہوش میں تو ہو۔"

ناصر ٹھٹک گیا۔ کیا یہ وہی لڑکی تھی جو اس کی گرج سن کر سرسوں کی طرح زرد ہو جاتی تھی؟ اسے یقین نہیں آرہا تھا۔ اس نے اپنی بے پایاں حیرت کو غصے کا سہارا دیا اور ایک بار پھر پروین پر جھپٹا۔ اس مرتبہ اس کے بائیں کان میں سیٹیاں سی بج گئیں۔ پروین کا بھرپور تھپڑ اس کے گال پر پڑا تھا۔ پھر وہ بھوکی بلی کی طرح اس پر چڑھ دوڑی۔

گھونسے' تھپڑ' ٹھوکریں' اس نے ناصر کو سنبھلنے کا موقع ہی نہیں دیا۔ اسے یہ بھی یاد نہیں رہا کہ اس کی جیکٹ میں بھرا ہوا پستول ہے اور وہ اسے کم از کم ڈراوے کے لیے تو استعمال کر ہی سکتا ہے۔ مین گیٹ تک پسپا ہوتے ہوتے وہ دو تین دفعہ گرا۔ اس کا تھائی دوست حالات کی "نامہربانی" دیکھ کر پہلے ہی گاڑی کی طرف کھسک چکا تھا۔ گیٹ پر پہنچ کر ناصر نے دیکھا کہ ایک بارعب یورپین اپنے مسلح گارڈ کے ساتھ لان کی طرف آرہا ہے۔ ناصر سمجھ گیا کہ اب یہاں ٹھہرنے میں مزید ذلت پوشیدہ ہے۔ وہ تقریباً دوڑتا ہوا گاڑی میں آبیٹھا۔ اس کا تھائی دوست انجن اسٹارٹ کر چکا تھا۔ بڑی چستی کا مظاہرہ کرتے ہوئے اس نے گیئر لگایا اور گاڑی آگے بڑھا دی۔ ان دونوں کے چہروں پر خوف کے ساتھ حیرت بھی منجمد تھی۔ یقیناً وہ پروین کے رویے کے بارے میں سوچ کر حیران ہو رہے تھے۔ انہیں معلوم نہیں تھا کہ اس سے پہلے ان کا واسطہ ایک مجبور لڑکی سے پڑتا رہا تھا جب کہ آج ان کا واسطہ ایک گناہ گار لڑکی سے پڑا ہے۔

جس وقت ناصر اور اس کا تھائی دوست افراتفری میں مین گیٹ سے نکلے اور اپنی گاڑی میں بیٹھے' شیراز احمد بھی اپنی رہائش گاہ کی چھت سے یہ منظر دیکھ رہا تھا۔ وہ بالکل بے خبر تھا کہ خاموش محبت کی اس کہانی میں اس کا کردار کیا رہا ہے اور کتنا اہم رہا ہے۔۔۔۔

PK .com